مولانا محمد حنیف ندوی

ایک آیت

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ترجمہ: ہم کو صراط مستقیم پر گام فرسا ہونے کی توفیق عطا کر۔ اس صراط مستقیم پر جس پر تیرے انعام سے بہرہ مند حضرات گام فرسا ہوئے۔ ان لوگوں کی راہ پر ہمیں نہ ڈال جن پر تیرا غضب بھڑکا۔ اور نہ ان لوگوں کی راہ پر جو جادۂ راست سے ہٹ گئے۔[1]

تشریح و وضاحت:

سورۃ الفاتحہ کے کئی نام ہیں۔ اس کو ام الکتاب بھی کہتے ہیں اور سبع مثانی بھی۔ الحمد سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور الصلوٰۃ سے بھی، اسے الشفاء کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، اور اساس القرآن کے نام سے بھی۔ اسی طرح اس کو الکافیہ بھی کہتے ہیں اور الواقیہ بھی۔[2]

الفاتحۃ تو یہ اس بنا پر ہے کہ اس کی حیثیت مضامینِ قرآن کے ایک دیباچہ کی سی ہے جس میں ان تمام معانی، اقدار اور تعلیمات کا تعارف کرایا گیا ہے جو اس کتاب ہدیٰ میں جابجا مذکور ہیں۔ ام الکتاب سے اس کی خصوصیت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس میں ان تمام آیات محکمات کا نچوڑ اور عطر بیان کر دیا گیا ہے جو مسلمانوں کے فکر و عمل کی اساس اور بنیاد قرار پا سکتی ہیں۔ سبع مثانی کہنے سے سورۃ کی اس اہمیت پر روشنی ڈالنا ہے کہ اس کی یہ سات آیتیں ایسی ایمان افروز اور ضیا بخش ہیں جن کو صبح و مسا نمازوں میں دہرایا جائے گا اور ان کی بدولت قلب و نظر کی روشنی فراہم کی جائے گی۔ الحمد سے یہ جتانا مقصود ہے کہ اس مختصر سی سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفات کو اور اس کی مدح و ستائش کے جملہ پہلوؤں کو اس

---

[1] سورۃ الفاتحہ ۷۔

[2] تفسیر ابن کثیر الدمشقی بضمن آیۂ مذکور۔

درجہ نکھار کر بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ بجائے خود الحمد کا مصداق بن گیا ہے۔ اور پھر چونکہ یہ نماز کی روح اور جان ہے اس بنا پر الصلوٰۃ ہے اور چونکہ قلب و ضمیر کی شفا بخشیوں کا اہتمام اس میں پایا جاتا ہے اس لیے الشفاء ہے۔ اساس القرآن کے نام سے موسوم کرنے سے غرض یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیمات کی رُو سے اس کو جو اصولی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے اس کو مطالعہ و تدبرِ قرآن کے دوران ہمیشہ ذہن میں رکھا جائے۔ الکافیہ اس کو اس وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اس میں جن عقائد، اقدار اور تعلیمات کا ذکر ہے اگر کوئی شخص ان پر دیانتداری سے عمل پیرا ہوتا ہے اور ان کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہیں متعین کرتا ہے تو یہ اس کی نجات کے لیے کافی ہے۔ اور الواقیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں نکھری ہوئی صاف اور واضح توحید کا بیان ہے۔ اس کو اگر مسلمان اپنا لیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ شرک و بدعت کی ہر گمراہی سے محفوظ رہیں گے۔

سورۂ فاتحہ کی اس جامعیت کے پیشِ نظر اندازہ لگائیے کہ جس آیت کی ہمیں سرِدست وضاحت کرنی ہے اس کی اہمیت کا مقام کیا ہوگا اور یہ اپنی آغوش میں فکر و عمل کے کن لطائف اور اجالوں کو لیے ہوگی۔

ان اُجالوں اور ان لطائف کی تفسیر دو انداز سے ہو سکتی ہے، باعتبار سیاق و سباق کے اور باعتبار نفسِ آیت کے۔ جہاں تک اس آیت کے اُن معانی کا تعلق ہے، جن کا تعلق سیاق کے تقاضوں سے ہے۔ ان میں اہم یہ بات ہے کہ ہر مسلمان دعا کے فلسفہ، آداب اور شرائط سے پوری طرح آگاہ ہو۔ دعا کے معنی یہ ہیں کہ انسان زندگی کے نشیب و فراز میں آئے دن خلل اور تضادات کے جن نقائص سے' دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اُن کی تلافی کے لیے اس خدائے قدوس کے بابِ اجابت پر دستک دے جو نہ صرف خود جمال و کمال کا پیکر تنزیہی ہے بلکہ اپنے جمال و کمال کی تابشوں سے دوسروں کی زندگی میں بھی امید و رجا کی کرنیں بکھیر سکتا ہے۔ دعا احساس احتیاج اور آرزوئے کمال کا دوسرا نام ہے۔ اور ایسے مقامِ اتصال سے تعبیر ہے جہاں آسمان و زمین باہم ملتے ہیں۔ یعنی جہاں بندہ عبودیت کے اُفقِ اعلیٰ تک رسائی حاصل کرتا ہے اور حضرتِ حق کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دعا کا یہ مطلب ہے کہ ناقص کامل کی طرف دستِ طلب بڑھاتا ہے اور کامل ناقص کی طرف توجہ فرماتا اور اس کی احتیاج و نقص کو دُور کرتا ہے۔ دعا کا یہ عمل دو طرفہ ہے ایک

طرف اگر ایک غلام اور ایک بندۂ عاجز متاعِ احتیاج لے کر اس کے حضور حاضری دیتا ہے تو دوسری طرف آقا و مالک اجابت و پذیرائی کے انعامات سے اس کو نوازنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔

پذیرائی اور اجابتِ دعا سے متعلق اس حقیقت کا جاننا بہت ضروری ہے کہ یہ دو واضح شرطوں کے ساتھ مشروط ہے جس میں پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کے بارہ میں جو تصور و عقیدہ قائم کیا جائے وہ توحید پر مبنی ہو اور قرآن حکیم کی ان آیات کے عین مطابق ہو، جو سورۂ فاتحہ میں بیان ہوتی ہیں جس کا یہ مطلب ہے کہ اس کو کسی خاص قوم اور گروہ کا رب ماننے کے بجائے پوری کائنات کا پروردگار تصور کیا جائے۔ اس کو رحمٰن تسلیم کیا جائے، اسے رحیم مانا جائے۔ اس بات کا اقرار کیا جائے کہ مرنے کے بعد قیامت کے روز صرف اسی کی بادشاہت و حکمرانی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ ذاتی سطح پر اللہ کے ساتھ بندگی و استعانت کے رشتوں کو استوار کیا جائے۔ یہی مطلب ہے ایاك نعبد و ایاك نستعین کا۔

اگر ہم اس کی توحید پر صدق دلانہ ایمان نہیں رکھتے اور اس کے فیوض رحمت و عفو کا کوئی نقش ہمارے دلوں پر مرتسم نہیں ہے۔ یا اس کی عبادت و بندگی سے گریزاں ہیں تو اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ ہم دعا کے استحقاق سے محروم ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ہماری دعا قبولیت و پذیرائی کی منزلیں طے کر لے۔ یوں وہ خود اگر بغیر کسی استحقاق کے کسی شخص کی دعا کو قبول فرمالیں تو یہ دوسری بات ہے۔ ہمیں اس سورہ میں جن آدابِ دعا کی تعلیم دی گئی ہے اس کا تقاضا بہرحال یہی ہے کہ مانگنے اور طلب کرنے سے پہلے جس سے مانگنا اور طلب کرنا ہے اس سے رسم و راہ پیدا کی جائے اور اسے اپنی بندگی و عبودیت کا یقین دلایا جائے۔

جہاں تک ان مطالب و معانی کا تعلق ہے جن کا نفسِ آیت سے اظہار ہوتا ہے ان میں اہم تر بات یہ ہے کہ دعا جس قدر جامع، زیادہ بلند اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر ہوگی اسی نسبت سے دعا کرنے والے شخص کے مقامِ عبودیت کا تعین ہوگا۔ یوں اس سے وابستگی اگرچہ یہی چاہتی ہے کہ ہر ہر بات کے لیے اس کے آگے دامنِ طلب پھیلایا جائے اور اپنی تمام ضروریات کے لیے اسی پر پورے پورے اعتماد اور بھروسہ کا اظہار کیا جائے۔ لیکن جب مراتب اور مقامات کا

قصہ چھڑے گا تب اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر اس سے مانگنا اور طلب کرنا ہی بندگی کا وظیفہ ٹھہرا تو کیوں نہ ایسی چیز طلب کی جائے جس کے پا لینے کے بعد دل میں کوئی حسرت و آرزو باقی نہ رہے۔

یہاں یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس آیت میں مسلمان جس چیز کا طلب گار ہو رہا ہے وہ ہدایت کی وہ نوعیت نہیں جس سے وہ بہرہ مند ہے۔ کیونکہ جو چیز اسے پہلے سے حاصل ہے اس کے حصول کے لیے خصوصیت سے دعا کیوں کی جائے۔ یہ ٹھیک ہے، صراطِ مستقیم پہ گام فرسا ہونا اور بات ہے اور اس پر قائم رہنا شئ دیگر۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ سے اس پہ قائم رہنے کی توفیق طلب کر رہا ہو۔ ہم تفسیر کے اس پہلو کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلاشبہ راہِ ہدایت پر قائم رہنا بہت بڑی بات ہے لیکن جب اس کے ساتھ اس آیت پہ نظر ڈالتے ہیں:

ومن یطع اللہ ورسولہ فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین و الصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولٰئک رفیقاہ[سہ]

ترجمہ: اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اس کو ان لوگوں کی معیت حاصل ہوگی جن کو اللہ نے اپنے فضل و انعام سے نوازا۔ یعنی انبیا، صدیق، شہید اور صلحا۔ اور یہ رفاقت کس درجہ اچھی ہے۔

تو ذہن کہتا ہے کہ صرف یہی قصہ نہیں۔ طلب و آرزو کی جس نوعیت کا سورہ فاتحہ کی اس آیت میں تذکرہ ہے وہ اس سے کہیں زیادہ جامع اور اعلیٰ ہے اور وہ اطاعت و پیروئ رسول کا وہ انداز، نہج اور مقام ہے جو آخرت میں مسلمانوں کو اس استحقاق کا سزاوار ٹھہراتا ہے کہ وہ انبیا کی رفاقت سے بہرہ مند ہوں۔ صدیقین کے مقام صدق و صفا سے لطف اندوز ہوں، شہدا پاک کے پہلو میں بیٹھ سکیں اور صالحین کے زمرہ میں شمار ہوسکیں۔ یعنی طلبِ ہدایت سے مراد خدا اور اس کے رسول کی وہ پیروی خاص ہے جس کے نتیجے میں ایک مسلمان انبیا علیہم السلام اور ان کے پیغام دعوت سے محبت و عشق کا سبق سیکھتا ہے۔ اور ایمان و یقین کے اس درجہ پہ فائز ہونے کی تمنا کرتا ہے جہاں جسم و جان کی ارتباطی

[سہ] النساء: ۶۹

منطق کے بجائے دل کی تصدیق آفریں منطق کی پرورش کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہی نہیں اس مرحلہ پر پیروی رسول کا جذبہ اخلاص کی ان حدود کو چھو لیتا ہے کہ جہاں نقدِ جاں نچھاور کرکے بھی جنون و وارفتگی کی تسکین نہیں ہو پاتی۔ یہ ہے وہ مقام اور نصب العین، اس آیت میں جس کے حصول کی خواہش و آرزو کا اعتبار کیا گیا ہے۔

یہاں ترکیب نحوی نے ایک اچھا خاصہ اشکال ابھار دیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ بدل ہے اور مبدل منہ اس سے قبل کی آیت ہے جس میں "منعم علیہم" کی راہ پر چلنے کی آرزو کا اظہار کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بدل اور مبدل منہ میں کیفیت تساوی پائی نہیں جاتی۔ اس لیے کہ یہ ضروری نہیں کہ اگر ایک گروہ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش نہ ہو تو وہ لازماً مغضوب و گمراہ قرار پاتا ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ دعا کرنے والا مسلمان ہو۔ جو اگرچہ اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بہرہ مند نہ ہو، تاہم گمراہ اور مغضوب بھی نہ ہو۔ ظاہر ہے اس صورت میں بدل کا اضافہ غیر ضروری ٹھہرتا ہے اور اس سے کسی نئے نقطہ کی وضاحت نہیں ہوتی۔

نحو کے اس اشکال کو سمجھنے کے لیے ہمیں نحو کی اس نوعیت پر غور کرنا ہوگا جس کا تعلق قوموں کے زوال و عروج سے ہے۔ قوموں کی تربیت و ساخت کی یہ نحو ہمیں بتاتی ہے کہ جب کوئی معاشرہ اپنی خواہش و آرزو، اور تگ و دو میں اعلیٰ تر نصب العین کو سامنے نہیں رکھتا اور اس کی روشنی میں اعمال کا نقشہ ترتیب نہیں دیتا یا اسلام کی جانی بوجھی اصطلاح میں عزیمت کو چھوڑ کر رخصت اور جواز پر قناعت اختیار کر لیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے بالآخر اسی راہ پر چل نکلتا ہے جو مغضوب اور ضال قوموں کی راہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ یا تو تم زندگی کے شب و روز اس طرح بسر کرو جس طرح انبیا، شہدا، صدیقین اور صلحا نے بسر کیے۔ اور یا پھر غضب و گمراہی کا ہدف بننے کے لیے تیار رہو۔

تفسیر کے اس انداز سے نہ صرف وہ اشکال دُور ہو جاتا ہے جو نحو سے پیدا ہوا بلکہ قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت بھی نکھر کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔